© rasailojaraid.com

حالات وواقعات

خورشید احمد ندیم

مذہبی فرقہ واریت کا سیاسی ظہور

مذہبی فرقہ واریت، ایک سونامی کی طرح، مشرقِ وسطیٰ کی سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اس کی لہریں پاکستان اور افغانستان تک پہنچ سکتی ہیں۔ مذہب اور سیاست کے باہمی تعلق کو نہ سمجھنے کا ایک اور خطرناک نتیجہ ہمارے سامنے آنے والا ہے۔

ایران کا انقلاب، 9/11 کی طرح مسلم دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اس میں شاید کوئی مبالغہ نہ ہو کہ سیدنا حسینؓ ابن علیؓ کی شہادت کے بعد یہ دوسرا بڑا واقعہ ہے جس نے مسلمانوں کی داخلی سیاست کو اتنے بڑے پیمانے پر متاثر کیا ہے۔ اس انقلاب کے بعد ہماری سیاست یقیناً وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ آج ہم مشرقِ وسطیٰ میں جو تبدیلیاں دیکھ رہے ہیں، ان کا ایک بڑا محرک یہی انقلاب ہے۔ تیل کی وجہ سے اس خطے میں عالمی قوتوں کی دلچسپی نے یقیناً یہاں کی سیاست پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن ۱۹۷۹ء کے بعد اس علاقے میں داخلی سطح پر جو تبدیلیوں پروان چڑھتی رہیں، ان پر بہت کم توجہ دی گئی۔ آج تبدیلی کا یہ عمل ایک واضح صورت اختیار کر چکا ہے، جس کے خدوخال ہم بچشمِ سر دیکھ سکتے ہیں۔

ایران کا انقلاب محض ایک سیاسی تبدیلی نہیں تھی، یہ شیعہ فکر میں ایک غیر معمولی تغیر بھی تھا۔ روح اللہ خمینی صاحب سے پہلے شیعہ علما کا دائرہ کار مذہبی وروحانی امور میں راہنمائی تک محدود تھا۔ عملاً وہ سیاسی عمل سے لاتعلق تھے۔ خمینی صاحب نے 'ولایتِ فقیہہ'' کا تصور دیا جس نے علما کے بھرپور سیاسی کردار کو دینی وعقلی استدلال فراہم کیا۔ شیعہ علما میں 'اصولی' اور 'اخباری' دو نقطہ نظر اگرچہ پہلے ہی سے موجود تھے اور اصولی علما اجتہاد اور روزمرہ امور میں راہنمائی کی ذمہ داری بھی ادا کرتے تھے لیکن سیاست میں ان کا کوئی قابلِ ذکر کردار نہیں تھا۔ خمینی صاحب نے 'نائبِ امام' کو امام کا قائم مقام قرار دے کر اس خلا کو عملاً ختم کر دیا جو امام کی غیر موجودگی کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔ جب ایران میں اس تصور کو پزیرائی ملی اور ان کی قیادت میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی واقع ہو گئی تو 'اخباری' نقطہ نظر عملاً ختم ہو گیا اور دنیا بھر میں اہلِ تشیع نے سیاست کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ امریکا میں رہائش پزیر ممتاز ایرانی محقق ڈاکٹر ولی نصر کے اس تجزیے سے مجھے پورا اتفاق ہے کہ اس انقلاب سے پہلے مختلف مسلمان ممالک میں اہلِ تشیع دوسری مرکزی

---

* کالم نگار روزنامہ اوصاف، اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریکوں کا حصہ تھے جیسے وہ مشرق وسطیٰ میں عرب قوم پرستی کی تحریک، بائیں بازو کی جماعتوں اور دوسرے سیاسی فورمز سے وابستہ تھے۔اس انقلاب کے بعد وہ شیعہ تحریکوں کا حصہ بنے اور انہیں اس کے لیے ایران کی حمایت بھی حاصل رہی۔ولی نصر نے اپنی کتاب 'شیعہ احیا' (The Shia Revival) میں بعض ایسے افراد اور ان کی سابقہ وابستگیوں کا ذکر کیا ہے۔

یہ تبدیلی عملی سیاست پر کیسے اثر انداز ہوئی، اس کا اندازہ عراق، لبنان، اردن اور بحرین کے حالات پر سرسری نظر سے ڈالنے سے کیا جا سکتا ہے۔اس مقدمے کی وضاحت میں، میں دو مثالوں کا ذکر کرتا ہوں۔۲۸۔فروری ۲۰۰۵ء کو عراق کے ایک شہر حلہ میں ایک خوش کش حملہ ہوا جس میں ۱۲۵ شیعہ مارے گئے اور ۱۵۰ زخمی ہوئے۔اس حملے کا ذمہ دار اردن کا ایک نوجوان منصور البنا تھا۔اس کی موت کی خبر جب اس کے آبائی قصبے السلط پہنچی تو وہاں اسے شہید قرار دیا گیا اور تین دن تک اس کا سوگ منایا گیا۔اس سوگ میں ان لوگوں کا کوئی ذکر نہیں ہوا تو اس حملے میں مارے گئے۔اس پر عراق میں بہت ردِعمل ہوا اور ۲۰ مارچ کو ایک مشتعل ہجوم نے اردن کے سفارت خانے پر حملہ کر دیا۔معاملہ مزید بگڑا اور دونوں ممالک نے اپنے اپنے سفارت کار واپس بلا لیے۔عراق اور اردن کے تعلقات میں یہ تلخی پہلے نہیں تھی۔اس کا اظہار تب ہوا جب عراق میں شیعہ برسر اقتدار آئے۔

بحرین کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔یہاں شیعہ آبادی کی اکثریت ہے۔ایرانی انقلاب سے پہلے اخباری نقطہ نظر غالب تھا۔اس کے بعد اصولیوں کا غلبہ ہے۔اس کا سبب نقطہ نظر کی تبدیلی ہے۔یہاں ۱۹۹۴ء میں شیعہ آبادی نے اپنے حقوق کے لیے تحریک اٹھائی۔۱۹۷۰ء میں بحرین کی آزادی کے بعد یہ سب سے بڑا ہنگامہ تھا۔۱۹۹۱ء میں نئے حکمران شیخ حامد بن عیسیٰ الخلیفہ نے سیاسی اصلاحات کا اعلان کیا تو انہیں زیادہ پزیرائی نہیں ملی۔اہل تشیع کی طرف سے ۲۰۰۲ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا گیا اور اب وہاں کے شیعہ، مذہبی جماعتوں کے علم تلے جمع ہیں۔ان میں الوفاق اور الجبہ الاسلامیہ لالتحریر البحرین نمایاں ہیں۔۲۰۰۳ء میں جب عراق ایک بڑی تبدیلی سے گزرا تو اس کا اثر بحرین میں بھی ہوا۔ دکانوں میں خمینی صاحب اور لبنان کے شیعہ راہنما حسین فضل اللہ کی تصویریں بڑی تعداد میں آویزاں تھیں۔۲۰۰۵ء میں جب ایک مقامی اخبار نے خمینی صاحب کا ایک کارٹون شائع کیا تو بطور احتجاج ایک بڑا جلوس نکالا گیا جو 'لبیک خمینی' کے نعرے لگا رہا تھا۔سعودی عرب کی جو سرحد بحرین سے ملتی ہے وہاں کی آبادی میں بھی شیعہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔سعودی عرب کو یہ پریشانی ہے کہ اگر بحرین میں شیعہ غالب آتے ہیں تو اس علاقائی قرب کی وجہ سے سعودی عرب بھی متاثر ہو سکتا ہے۔چنانچہ اس نے بحرین میں حالیہ شیعہ تحریک کو دبانے کے لیے بحرین میں اپنی افواج بھیج دیں۔اس وقت سعودی عرب کے ان علاقوں میں شیعہ آبادی بحرین میں فوج بھیجنے کے خلاف مظاہرے کر رہی ہے۔مذہبی مسلک کے اس سیاسی استعمال کا سب سے زیادہ نقصان تصورِ قومیت کو پہنچ رہا ہے۔اب سعودی عرب کے شیعہ شہری کی وفاداری اپنے ملک سے زیادہ ایران سے ہوتی ہے اور ایران کا سنی شہری ممکن ہے سعودی عرب یا کسی دوسرے ہم مسلک ملک سے خود کو ذہنی طور پر زیادہ قریب محسوس کرتا ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشرق وسطیٰ کی سیاست جس طرح مذہبی فرقہ واریت سے متاثر ہو رہی ہے، اس کے مظاہر عالم اسلام کے دیگر حصوں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پاکستان بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ عراق ایران جنگ میں ہم نے اس کی ابتدائی جھلک دیکھی۔ مجھے خدشہ ہے کہ چند دنوں تک اس کے مزید مظاہر بھی سامنے آ سکتے ہیں۔ ہماری مذہبی جماعتوں میں سعودی عرب اور ایران کے لیے جو نرم گوشہ ہے، اس کا اظہار ہونے لگا ہے۔ ایک مسلک کے رسائل میں سعودی عرب کی حمایت کی جا رہی ہے اور ان واقعات کو سعودی عرب کی اسلامی حکومت کے خلاف ایک سازش قرار دیا جا رہا ہے۔ جواباً ایران کی حمایت میں بھی لکھا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ جلسوں جلوسوں تک پھیل سکتا ہے۔

میرے نزدیک مذہبی فرقہ واریت کا سیاسی ظہور عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اور اس سے امریکا جیسی قوتیں فائدہ اٹھائیں گی جن کی نظر اس خطے کے وسائل پر ہے۔ یہ مذہب اور سیاست کے تعلق کو صحیح تناظر میں نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی زندگی دین کے احکام کے تابع ہونی چاہیے اور اس سے سیاست کا کوئی استثنا نہیں ہے لیکن اہل مذہب نے اس کی جو تعبیر کی گئی ہے وہ محل نظر ہے۔ ہمارے ہاں اس کا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ اسلام کے سیاسی غلبے کے لیے جماعتیں بنی چاہیں۔ اب عملاً یہ ہوا کہ ہر مسلک کے لوگوں نے اپنی سیاسی جماعت بنالی اور انہوں نے اپنے مسلک کی روشنی میں سیاسی نظام تشکیل دینا چاہا اور اسے اسلام کی واحد تعبیر قرار دیا۔ یوں اسلامی ریاست کا تصور پاپائیت میں بدل گیا کیوں کہ اس میں مذہبی تعبیر کا حق ایک خاص گروہ کے لیے خاص ہو گیا۔ اسی کا نام پاپائیت ہے۔

قرارداد مقاصد تک حالات یہ نہیں تھے۔ اس قرارداد نے ریاست کی نظری سمت کا تعین کر دیا اور حکومت کا حق جمہور کو دے دیا۔ اس کا منطقی نتیجہ ۱۹۷۳ء کا آئین ہے۔ یہ ایک ایسی متوازن دستاویز ہے جس کے بعد مذہبی فرقہ واریت کے سیاسی ظہور کا امکان ختم ہو گیا۔ اگر یہاں مذہبی سیاسی جماعتیں نہ ہوتیں تو مذہب کے نام پر کوئی سیاسی قضیہ پیدا نہ ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں سیکولرزم کا غلبہ ہو جاتا۔ میرے نزدیک ایک جمہوری پاکستان کبھی سیکولر نہیں ہو سکتا۔ جب تک یہاں دینی مدارس، علمی تحقیق کے مراکز اور دعوتی تحریکیں موجود ہیں، قوم کا نظری تشخص تبدیل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے مذہبی سیاست کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم سے لے کر آج تک، کسی سیاسی قیادت کا مذہبی مسلک ہمارے ہاں کبھی زیر بحث نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف ایران میں حکومت مذہبی لوگوں کے ہاتھ میں آئی تو ریاست کو آئینی طور پر ایک خاص فقہ سے منسوب کر دیا گیا۔ یہی کچھ افغانستان میں ہوا جب وہاں ایک مذہبی گروہ برسر اقتدار آیا۔

ریاست اور مذہب کا باہمی تعلق جس طرح پاکستان میں، آئین اور سماج کی سطح پر سامنے آیا ہے، وہ پورے عالم اسلام کے لیے مثال بن سکتا ہے۔ اگر تمام مسلمان ملک جمہوری ہو جائیں اور قرآن وسنت کی لازمی راہنمائی پر مبنی ایک عمرانی معاہدے کو اختیار کر لیں تو مسلکی وفقہی اختلاف اجتماعیت پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ عالم اسلام پر اپنا اثر ڈالنے کی بجائے، ہم دوسروں کا اثر قبول کر رہے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ اوصاف)

© rasailojaraid.com